© rasailojaraid.com

تعارف وتبصرہ

مولانا ابوالکلام آزاد

پیرسنہ۱۹۸۸ء اور اس کے بعد کی مطبوعات کا تجزیہ

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی

مولانا آزاد کی پیدائش کے سو سال پورے ہونے پر اردو اور انگریزی میں کافی لٹریچر شائع ہوا ہے۔ اس لٹریچر میں مستقل کتابوں کے علاوہ برصغیر ہند اور پاکستان کے اہل قلم نے بکثرت مقالے بھی لکھے۔ اسی عرصہ میں الہلال کے فائیل بھی دوبارہ شائع کیے گئے۔ اس سے آنے والے محققین کے لیے مولانا کے افکار کو سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس لٹریچر میں انگریز مشنری آئی۔ ایچ۔ ڈگلس کی کتاب "مولانا آزاد کی ذہنی اور مذہبی سوانح عمری" بھی شامل ہے۔ اس کا تحقیقی معیار کافی بلند ہے۔ اس میں مولانا کی زندگی اور ان کے علمی اور سیاسی کارناموں کے علاوہ ان کے مذہبی افکار کا سائنٹفک طریقہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔ مولانا پر جتنے ماخذ ہو سکتے ہیں ان سے بڑی خوبی کے ساتھ اور بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈگلس کے اس تحقیقی کام کے شائع ہونے سے چند ماہ پہلے ڈاکٹر عارف الاسلام کی کتاب بعنوان "مسیح کون؟ سرسید یا آزاد" شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا ہم اپنے تبصرہ کا آغاز اسی کتاب سے کرتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد احساس ہوتا ہے کہ اگر اس کا عنوان "مسلم ہندوستان سرسید سے آزاد کے عہد تک" ہوتا تو اچھا تھا۔ اس کا پہلا حصہ دوسرے حصہ کی بہ نسبت زیادہ ضخیم ہے ان کی اصلاحی تحریک اور مسلمانوں کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی سے متعلق ان کی مساعی سے بحث کرتا ہے فاضل مقالہ نگار نے سرسید کی تحریروں اور علی گڑھ آرکائیوز کا تجزیہ کرتے میں بڑی دیدہ ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ سرسید سے متعلق ابواب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے علی گڑھ تحریک کی مذہبی اور ثقافتی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

آخری ابواب مولانا آزاد کی سیاسی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان کے لکھنے میں بھی گو بڑی محنت کی گئی ہے لیکن کہیں کہیں تنقید میں شدت کا احساس ہوتا ہے۔ شدت کی وجہ غالباً وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مایوسی اور غم و غصہ ہے جو مسلم نوجوانوں میں ۱۹۴۷ء یعنی حصولِ آزادی کے بعد پایا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی اور معاشی پریشانی کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی تعلیم یافتہ شخص جو جدید تحقیقی اسالیب (Reserch Methodology) سے بخوبی واقف ہے اور انھیں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی تحقیق مولانا آزاد کے حامیوں اور مداحوں کی نگارشات سے مختلف ہوگی۔ مولانا کی ظاہری شخصیت، کارکردگی، افکار اور عمل میں بسا اوقات تضاد ملتا ہے۔ لیکن اس چیز کو غیر جانبداری کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا ہے جو کہ مصلحت کے بجائے معروضی نقطۂ نظر کا حامل ہو۔ مثال کے طور پر مولانا مرحوم جمال الدین افغانی کے زیر اثر پان اسلامزم کے قائل تھے اور یہ اثر اُن پر ۱۹۲۲ء تک رہا۔ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک واحد قوم تصور کرتے تھے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں: "ملت اسلامیہ ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو اُن میں کوئی رشتہ انسلاک ہے نہ وحدتِ ملت کا کوئی رابطہ نہ کوئی قائد و امیر ہے۔ محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً یہ ایک حیات غیر شرعی اور جاہلی ہے"۔ لیکن ترکی میں کمال اتاترک کی فتح کے بعد ان کے رویہ میں یکایک تبدیلی آگئی۔ وہ سلطانِ ترکی کی خلافت کے قائل تھے۔ جب کمال اتاترک نے اس کو ختم کرکے ترکی کو جمہوریہ میں تبدیل کیا تو مولانا نے اتاترک کو مبارک باد ہی نہیں دی بلکہ خلیفہ کو غاصب بھی بتایا۔ اس پر عارف الاسلام بجا طور پر تنقید کرتے ہیں: "اتنا واضح تضاد شاید ہی کسی دوسرے لیڈر کے خیالات میں پایا جاتا ہو۔ مگر یہ تضاد نہ تھا بلکہ یہ مولانا کی ضرورت تھی کانگریسی نیشنلزم کو مضبوط کرنے کے لیے وہ ہر طرح کا حربہ استعمال کرسکتے تھے اور جہاں جس بات سے فائدہ ہوتا وہی بات کہتے تھے۔" (ملاحظہ کیجئے ص ۱۲)

۱۹۰۶ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے مسلم اکثریت کے بنگال کے علاقہ یعنی مشرقی بنگال کی معاشی پس ماندگی کو ختم کرکے اس کو ترقی کی راہ پر لانے کے لیے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اس پر ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی۔ اس تحریک سے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے کیونکہ مشرقی بنگال میں غریب مسلمانوں کا زمین دار اور سرمایہ دار استحصال کر رہے تھے۔ تقسیم سے کسی حد تک مسلمانوں کی غربت ختم ہوسکتی تھی۔ لیکن ہندوؤں کو انگریزی حکومت سے خاص شکایت تھی کہ وہ مسلمانوں کو خوش کر رہی ہے۔ تمام مسلم اکابرین کے برعکس مولانا آزاد نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی۔ اسی زمانہ میں وہ ہندو انقلابیوں اروند وگھوش اور شیام چندر چکرورتی کے ساتھ ہوگئے جبکہ یہ دونوں لیڈر مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اور اسی لیے تقسیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنگال کے مخالف تھے۔ مولانا آزاد کی ان انقلابیوں میں شمولیت کو مشیر الحق نے ایک بہت ہی مشکل کام تصور کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"It was a difficult task for him because the revolutionaries were exclusively Hindus and activity anti-Muslim" (Muslim Politics in Modern India, P.69)

عارف الاسلام آزاد کی اس تحریک میں شمولیت کا باعث اُن کی مسلمانوں سے بے تعلق اور مسلم مسائل سے عدم توجہی سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ "سیاسی کارروائیوں کی شروعات ہی مولانا نے عام مسلمانوں کے مفاد کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کی حمایت سے کی"۔ (الفاظ کچھ ملا ۱۱۵)

اسی طرح پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر مولانا آزاد کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تحریک کی مخالفت کا کوئی معقول جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تحریک کے قائدین کا ہندوستانی مسلمانوں میں اثر تھا اور جس کو ختم کیے بغیر کسی دوسرے کو لیڈر کی حیثیت سے ابھرنے میں دشواری تھی لہٰذا مسلمانوں کی قیادت حاصل کرنے کے لیے آزاد نے یونیورسٹی بنانے کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی شدت سے مخالفت کی اور تحریک کے عمائدین پر بھی بھرپور حملے کیے آزاد کی تقریروں سے مصنف نے اقتباسات دے کر ان پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ آخری صفحات میں مصنف کے تبصرہ کا لب لباب یہ ہے کہ مولانا آزاد کو ہندوستانی مسلمانوں سے ہمدردی کے بجائے کانگریس اور اپنی لیڈر شپ سے دلچسپی تھی لیکن مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ اگرچہ اس دور میں مولانا کا دینی رجحان بہت کمزور پڑ گیا تھا اور شاید نماز روزہ کے بھی پابند نہیں تھے تاہم وہ نفسیاتی اور ثقافتی طور پر مسلمان رہے اور خود کو مسلم معاشرہ کا حصہ سمجھتے رہے۔ غالباً عارف الاسلام کی نظر اُس خط و کتابت پر نہیں پڑی جو کہ آزادی ملنے سے پہلے مولانا اور گاندھی جی کے درمیان رہی۔ دراصل اس خط و کتابت کو نہ تو آزاد نے محفوظ رکھا اور نہ گاندھی جی نے۔ اتفاق سے محکمہ خفیہ کے انگریز افسر نے سینسر کر کے ان کی نقل وائسرائے کو بھیجی تھی یہ محفوظ ہو گئی اور اب شائع بھی ہو گئی ہے۔ مولانا نے گاندھی جی کو مشورہ دیا تھا کہ مسلم لیگ کے اثر کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلم اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لیے کانگریس کو یقین دہانی کرنی چاہیے اور اُن کے اس خوف کا مداوا کرنا چاہیے کہ اکثریت کے سامنے اقلیت اپنے تشخص کو نہیں کھوئے گی۔ ان کی یہ تجویز بھی تھی کہ یہ آئینی طور پر مان لینا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے کہ مملکت کا صدر ایک دفعہ ہندو ہوگا تو دوسری دفعہ مسلمان۔ لیکن گاندھی جی کو اتفاق نہیں تھا کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلم فرقوں کے علاوہ دوسرے فرقے بھی ہیں۔ دوسرے فرقوں کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہ خط وکتابت سروئی نے اپنی کتاب :-

Partition of India : Legend and Reality

میں استعمال کی ہے۔

(۲) دوسری اہم تصنیف آئی۔ ایچ ڈگلس کی انگریزی زبان میں مولانا آزاد کی سوانح عمری "ابوالکلام آزاد۔ ایک ذہنی اور مذہبی سوانح عمری" ہے ڈگلس ایک انگریز مشنری تھے جو کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں ملٹری سروس کے سلسلے میں ہندوستان آئے تھے اور پھر عرصۂ دراز تک ایک مشنری کی حیثیت سے رہے۔ انھیں ہندوستان میں مسلمانوں کی ثقافت اور دینی زندگی سے دلچسپی ہوئی لہٰذا انھوں نے ہندوستان میں اسلام سے متعلق تحقیق کرنے کا ارادہ کیا۔ انگلینڈ کے مشہور مستشرق جنھوں نے قرآنیات پر کام کیا ہے انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ ابوالکلام آزاد کے علمی کاموں پر تحقیق کریں۔ لہٰذا انھوں نے ریسرچ ڈگری حاصل کرنے کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کئی سال کی کاوش اور مطالعہ کے بعد اپنا مقالہ مکمل کر کے آکسفورڈ یونیورسٹی میں پیش کیا۔ ۱۹۷۵ء میں ڈگلس کا انتقال ہوگیا ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر مینالٹ گیل اور سی، ڈبلو، ٹرول کی دلچسپی کے باعث آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نئی دہلی سے شائع ہوا ڈگلس کے لکھے ہوئے ابواب کے بعد گیل اور ٹرول کے لکھے ہوئے باب کا اضافہ ہے۔ جس میں دونوں نے ڈگلس کی تحقیق کے بعد جو نیا تحقیقی لٹریچر سامنے آیا ہے اس کا جائزہ لیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کہیں کہیں ڈگلس سے اختلاف بھی کیا ہے۔

ڈگلس کا مقالہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں جس کا عنوان *Introduction* یعنی مقدمہ ہے اس میں مولانا آزاد کے خاندانی حالات اور اُن کی پیدائش کا ذکر ہے اس میں ۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کے دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ باب کئی قسطوں پر مشتمل ہے اور ہر قسط ایک نئی سرخی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ آخری تین قسطوں کی سرخیاں ہیں "سرسید کا اثر"، "مذہبی عقیدہ کا کھو جانا"، "سیاسی فکر کی تشکیل اور عقیدہ کی بازیافت۔" ڈگلس نے ہر حصہ کو بڑی خوش اسلوبی اور معروضیت کے ساتھ لکھا ہے۔ اس حصہ کے ماخذ خود آزاد کی تحریریں ہیں۔ جہاں پر سرسید کے اثر سے آزاد میں ابھرنے والی انقلابی نوعیت کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی واضح کیا ہے کہ آزاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مقابلہ میں سرسید ذہنی طور پر مذہبی آدمی تھے، سرسید کا فکر اور عمل دونوں اُن کے مذہبی عقیدہ سے متاثر تھے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں مولانا آزاد کی صحافتی زندگی یعنی الہلال وغیرہ کی اشاعت اور سیاسی کارکردگی کا ذکر ہے۔ یہ حصہ ۱۹۲۲ء تک کے دور کا مطالعہ ہے حزب اللہ کی تشکیل اور اس مشن کی ناکامی کے اسباب پر بڑی سیر حاصل بحث ہے۔ ڈگلس کا خیال ہے کہ اس طرح کے کام کے لیے جو صبر و ثبات مطلوب ہے وہ مولانا کے مزاج میں نہ تھا لہٰذا وہ اصلاح اور حزب اللہ کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس کام کو بعد میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے شروع کیا اور ان کی تحریک جماعت اسلامی کی شکل میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ ڈگلس نے یہ بات عزیز احمد کے حوالہ سے کہی ہے البتہ عزیز احمد اور ڈگلس دونوں ہی یہ محسوس نہیں کر سکے کہ مولانا مودودیؒ میں خلوص اور دینی خدمت کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے انھوں نے تحریک چلائی، اعلیٰ اسلامی لٹریچر لکھا اور بڑے صبر کے ساتھ کام میں مصروف رہے۔

دوسرے باب کے بعد ڈگلس نے مولانا آزاد کے اس خط کا انگریزی میں ترجمہ پیش کیا ہے جو کہ آزاد نے مولانا سلیمان ندوی کو اُن کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ خط بڑا اہم ہے کیونکہ جواب میں آزاد نے اپنے دہریت کے دور، مے نوشی اور مذہبی بے راہ روی کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی یقین دلایا ہے کہ وہ بہت سی کمزوریوں کا تدارک کر چکے ہیں اور مذہب میں کھویا ہوا عقیدہ دوبارہ انھوں نے حاصل کر لیا ہے۔

تیسرے حصہ یا باب میں مولانا آزاد کی مذہبی اسکالرشپ ترجمان القرآن کی اہمیت اور نیشنل سیاست پر بحث ہے یعنی ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۸ء تک کے حالات کا بے لاگ مطالعہ ہے۔ پہلے ابواب کی طرح اس باب میں بھی تمام واقعات کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کہیں بھی تحقیقی مواد کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ چوتھا باب کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس میں مولانا آزاد کی شخصیت سے بحث ہے۔ اس کے بعد پس نوشت ہے۔ جس میں ڈگلس نے ایوانِ صدر جمہوریہ ہند میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ملاقات کے دوران میں ذاکر صاحب نے ڈگلس سے پوچھا کہ مولانا آزاد پر ان کی ریسرچ کی کیا صورت ہے؟ ڈگلس نے جواب میں کہا کہ ریسرچ کے نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا کام جاری رکھئے لیکن فراخ دلی سے کام لیجئے۔ ڈگلس لکھتے ہیں کہ وہ فراخ دلی سے کام جاری رکھنے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامیاب ہوئے ہیں۔

یقیناً ہندوستان اور پاکستان کے اسکالرس نے آزاد پر جو کتابیں اور مقالے شائع کیے ہیں اُن میں ڈگلس کی کتاب سب پر سبقت رکھتی ہے۔ اُن کا بحیثیت محقق عمل (approach) غیر جانبدار رہا ہے۔ اردو اور ہندی میں لکھنے والوں کی طرح نہ تو انھوں نے قصیدہ گوئی سے کام لیا ہے اور نہ ہی مخالفت میں مولانا کی خوبیوں کو بھی برائیوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈگلس کی Methodology یورپین ہے لہٰذا کتاب کا معیار بھی بہت بلند ہے۔ اگر کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو جائے تو اردو میں لکھنے پڑھنے والوں کو تحقیق سے متعلق نئے اسالیب سے واقفیت ہوگی۔

۳۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ادارہ سہ ماہی فکر و نظر نے اگست ۱۹۸۹ء میں خصوصی شمارہ (مولانا) ابوالکلام آزاد نمبر شائع کیا۔ اس میں اداریہ کے علاوہ ۱۹ مقالات ہیں۔ ہر مقالہ نگار نے بے لاگ تنقید سے گریز کیا ہے۔ پہلا مقالہ آل احمد سرور صاحب کا ہے۔ یہ ڈگلس کی کتاب پر مفصل تبصرہ ہے۔ سرور صاحب کتاب کے اعلیٰ معیار سے بجا طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اردو کے اہل قلم کی روایت کے مطابق سرور صاحب نے زیادہ زور آزاد کے ان تابناک پہلوؤں پر دیا ہے جن کو ڈگلس نے اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اُن پہلوؤں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جو کہ آزاد کی شخصیت کے غیر تابناک پہلو کہے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسرے باب پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد کے سید سلیمان کے نام خط کا مختصر حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے :۔

"اس باب کے آخر میں مولانا آزاد کے مشہور خط کا انگریزی ترجمہ دیا ہے جو انھوں نے فروری ۱۹۱۳ء میں سید سلیمان ندوی کو اُن کے مراسلے کے جواب میں بھیجا تھا۔" خط کے متن پر کچھ نہیں کہا۔

ڈگلس نے آزاد کی تقاریر پر بحث کرتے ہوئے اُن کی شانتی نکیتن کی تقریر جو کہ انھوں نے آزادی کے بعد وہاں سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر دی تھی تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آزاد کا بیان کہ شنکر آچاریہ کے فلسفہ اور ابن العربی کے فلسفہ میں مماثلت ہے، حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ڈگلس کا مطالعہ مختلف مذاہب کا تھا لہٰذا وہ آزاد کی اس غلطی کی نشاندہی کر سکتے تھے۔ سرور صاحب نے اس واقعہ کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ دراصل ابھی تک اردو میں بے لاگ تنقید کی روایت بہت کمزور ہے۔

© rasailojaraid.com